شورش کاشمیری

رئیس الاحرار، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۱ر صفر ۱۳۱۰ھ ـــــ ۳ر جولائی ۱۸۹۲ء)

''۱۳۷۶ھ ـــــ ۲ر ستمبر ۱۹۵۶ء''

دسمبر ۱۹۴۱ء کا ذکر ہے کہ راقم اور کچھ دوست منٹگمری سنٹرل جیل میں قید کے دن گزار رہے تھے کہ ایک اخلاقی قیدی جو ہماری خدمت پر مامور تھا، کمرہ میں دوڑا آیا اور کہا۔ لیجیے افغانستان کے ایک بڑے وزیر قیدی بن کر آ گئے۔ انھیں قیدیوں کے وارڈ میں رکھا گیا ہے۔ ہم میں سے تقریباً سب نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی کیونکہ ایک تو اس کے متعلق ہمارا خیال یہ تھا کہ دہلوی ہونے کے باعث رگ گل سے بلبل کے پر باندھتا ہے۔ اور دوسرے ہم اس وقت بھوک ہڑتال کی اسکیم بنانے میں اس قدر محو تھے کہ ہمارے لیے کسی وزیر کا اسیر بن جانا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا اور یوں بھی یہ بات کچھ جچتی نہیں تھی کہ افغانستان کا وزیر یہاں کیوں؟ بہرحال ایک بات تھی ہوگئی کچھ دن گزرے تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ بھئی آپ لوگوں کو مولانا حبیب الرحمٰن سلام کہتے ہیں۔

احسن عثمانی نے جلدی میں پوچھا کیا ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں؟ کہا نہیں وہ تو ہفتہ عشرہ سے سرکاری مہمان ہیں۔

'سرکاری مہمان ہیں''

جی ہاں!

یہیں سے عقدہ کھلا کہ افغانستان کے وزیر ہونے کا اشتباہ بھی آپ پر ہی کیا گیا تھا۔ مولانا کی دراز قامتی، دراز ریش، بارونق چہرہ، چال میں تمکنت اور حجازی عبا کے پہناوے نے اخلاقی قیدیوں کو مغالطے میں ڈال دیا۔ اور کچھ انھوں نے اپنی خاص قسم کی نفسیات کے تحت بتایا کہ افغانستان کا وزیر قیدی بنایا گیا ہے۔ جن لوگوں کو جیل خانے میں سی کلاس قیدیوں سے ملی جلی زندگی بسر کرنے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس طبقہ کی نفسیات کیا ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں رائی کا پہاڑ بنا لینا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو افسانوی رنگت دینا دن رات کا مشغلہ سمجھا جاتا ہے۔ مولانا کے متعلق وزیر افغانستان ہونے کی تہمت نے سر پیر نکالے تو پھر طرح طرح کی باتیں بھی ساتھ ہی ٹانک دی گئیں۔

خود ہمارے مشفقی (قیدی خدمت گزار) نے ہم سے بیان کیا۔

صاحب کیا پوچھتے ہو، جرمنی کے ساتھ سمجھوتہ کیا تھا بھید کھل گیا اور اب دھر لیے گئے ہیں۔ گویا اس بے چارے کے خیال میں افغانستان بھی برطانوی ہند کا ایک صوبہ تھا اور وزیر افغانستان قومی رہنما تھے۔ جو قانون دفاع ہند کے ماتحت ماخوذ تھے۔

مولانا کو منٹگمری جیل میں آئے ہوئے پانچ چھے ہفتے گزر گئے لیکن ہمارے اور ان کے درمیان سنگ وخشت کی دیواروں کے علاوہ قانونی دیواریں بھی مزاحم تھیں اور حکام نے سنکدر حیات آنجہانی کی وزارت کے احکام کی مطابقت میں ہمارے اور اُن کے میل جول کی تمام راہیں مسدود کر رکھی تھیں۔ چند دنوں ہی مولانا کے رعب داب، ٹھاٹھ باٹھ، سج دھج اور چال ڈھال نے طلسم ہوش ربا کے بعض پراسرار کرداروں کی طرح قیدیوں میں ایک خاص معمہ کی صورت اختیار کر لی اور وہ عموماً آپ کا ذکر عقیدت واحترام، خوف وہراس اور ہیبت وحیرت سے کیا کرتے۔

ہم نے بھی اس میں اضافہ ہی مناسب سمجھا اور اپنی طرف سے زیب داستان کی سرخیاں مہیا کر دیں۔ دو اڑھائی ماہ کی تگ ودو کے بعد چوری چھپے ملاقات کا موقع پیدا ہو گیا اور جیل خانے کے عقبی حصہ میں راقم سے ملاقات ہو گئی نہایت محبت سے معانقہ کیا۔ پوچھا کہو لکھا پڑھی کا حال کیا ہے عرض کیا شاعری پڑھتا ہوں نثر لکھتا ہوں۔ فرمایا: ''کیا لکھ رہے ہو میرے حالات؟''

''جی ہاں''

اتنے میں جمعدار نے کہا ذرا جلدی فرمایئے داروغہ جی آ رہے ہیں۔ مصافحہ کیا اور ہم ایک ہی جیل میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ اور وہ لمبی لمبی دیواریں ہمارے درمیان حائل ہو گئیں جو سینٹرل جیل منٹگمری میں ایوان انصاف کی سنگدلی کا پتہ دیتی ہے۔

کوئی پندرہ روز بعد مجھے ایک کاپی ملی جس میں آپ کے لکھوائے ہوئے حالات زندگی کا دل آویز خاکہ تھا۔ پیشانی پر مرقوم تھا میں کیا اور میرے حالات زندگی کیا، چند واقعات ہیں جو اس لیے لکھوائے دیتا ہوں کہ پڑھنے والوں کو عبرت ہو۔

یہ صحیح ہے کہ انسان کو بہت سی چیزیں سماج میں تجربہ وتعلیم سے ملتی ہیں لیکن بعض خصائص طبعی طور پر ایسے بھی ہوتے ہیں جو خاندان سے ورثہ میں ملتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے لطف عمومی سے طبیعت کا حسن بن کر فطرت ہو جاتے ہیں۔

مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن کے پردادا حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ پنجاب میں تنہا بزرگ تھے۔ جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف لدھیانہ میں فتویٰ دیا اور چند روز کے لیے شہر میں متوازی گورنمنٹ قائم کی۔

آپ کے دادا حضرت مولانا محمد علیہ الرحمۃ نے اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس علم کو بلند رکھا اور جب کانگریس نے ہندوستان میں اپنا ابتدائی ڈھانچہ تیار کیا تو ہندوستان وحجاز کے علماء سے بھی اس کے حق میں فتویٰ لیا اور خود بھی اپنی بصیرت کی روشنی میں فرمایا کہ مسلمان کے لیے کانگریس کی شرکت جائز ہے۔ دراصل مرحوم ان بزرگوں میں سے تھے۔ جنھیں مشیت ایزدی اپنے شمع نور سے اطاعت وبندگی کے صلہ میں اجاگر کرتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ صفحۂ ہستی پر برطانیہ سے بڑھ کر مسلمانوں کا کوئی دشمن نہیں اور وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں جو حالات پیدا ہو گئے ہیں ان کے پیشِ نظر ہندو مسلم کے اشتراک ہی سے برطانوی نظم ونسق میں خلل ڈالا جا سکتا ہے۔

انگریز دشمنی کا یہ جذبہ مولانا حبیب الرحمٰن کو ورثہ میں ملا ہے اور یوں کہنا چاہیے کہ ان کے زندگی کے عناصر اربعہ کا ایک جز ہے حتٰی کہ ان کے خون کی گردش ہی اس سے قائم ہے اور طبیعت کا حسن بن کر فطرت کی نیو بن گئی ہے اور یہی جذبہ آپ کی اولاد کی رگ و پے میں بھی جاری ہے۔ قدرت نے آپ میں بہت سے خصائص جمع کر دیے ہیں۔ وہ.....اگرچہ باقاعدہ مدارس کی دستار فضیلت نہیں رکھتے اور زمانہ کی عام روایتی سندوں کا سرمایہ بھی ان کے پاس نہیں لیکن علما کی محفل میں بیٹھ جاتے ہیں تو خنک لفظوں سے چشمہ صافی کی موجوں سے ایسے معانی ٹپکے پڑتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک درویش مدرسوں سے پڑھے ہوئے اسرار و رموز بیان کر رہا ہے۔

سیاست کے یورپی جوڑ توڑ سمجھنا سہل نہیں۔ ہمارے علما کی ایک کوتاہی ہے کہ جہاں وہ انگریزی زبان سے نابلد ہیں وہاں انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس سیاست کے داؤ پیچ سے کیونکر نپٹا جا سکتا ہے۔ وہ دراصل چودھویں صدی کے اس زمانے میں قرون اوّل کے معاشرتی تصور کی فضا میں گھوم پھر رہے ہیں اور راقم کا عقیدہ ہے کہ جو پانی بہہ چکا ہوا سے واپس لانا محال ہے۔ محال کیا بلکہ چلتی ہوئی زندگی کی طرح اس کا کوئی نقش بھی واپس نہیں لایا جا سکتا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو تو چھوڑیے کہ وہ جامع کمالات ہونے کے باعث علماء میں ایک استثنائی مرتبہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی زبان کو سیکھا اور پھر اس کے علم و نظر کے ہر گوشے میں قابو پا لیا۔ دوسرے راقم کے نزدیک وہ اس دور میں اسلام کے واضح تصور کا صحیح فکری مظہر ہیں لیکن ان کے علاوہ ان کے برابر نہیں علما کی صف میں جو شخص راقم کے خیال میں جدید و قدیم تصورات کے درمیان سنگم بن سکتا ہے۔ وہ مولانا حبیب الرحمٰن ہیں اور راقم نے بارہا دیکھا کہ ان میں ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھنے کی کا جوہر فطری استعداد کے طور پر موجود ہے۔

وہ معاملہ کی تھا کو پا لیتے اور گفتگو اور چہرے سے معلوم کر لیتے ہیں کہ اس کا پس منظر کیا ہے اور پھر ہلکے پھلکے الفاظ میں تجزیہ کر کے سمجھانا چاہتے ہیں۔ گو انھیں ابوالکلام کی شستہ زبان نہیں ملی اور نہ بخاری کی طرح بیان کی افسانوی شوخی ان کا شیوۂ گفتار ہے۔ لیکن چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑی بڑی باتیں ادا کر جاتے ہیں۔ اور ادیب نہ ہونے کے باوجود ادب کا وقار و متانت ہاتھ سے نہیں دیتے، سنجیدگی آپ کے کلام کا زیور ہے اور بہادری آپ کے دامان کردار کی سنہری جھالر۔

کرپس جب پہلی دفعہ ہندوستان آیا تو میاں افتخار الدین کے مکان پر آپ اس سے ملنے گئے، ہندوستان کی سیاست پر ایک گھنٹہ گفتگو ہوئی اور جب وہ رخصت ہونے لگے تو اس نے کہا کہ آپ مجھے ایک دفعہ پھر ملیے گا۔

میں پروگرام کے مطابق آج کلکتہ جا رہا ہوں اگر آپ وہاں پہنچ جائیں تو مجھے اپنے مقصد کے لیے کئی گم شدہ راہیں مل سکتی ہیں۔ اور پھر اس نے بعض صحافی حضرات کو ملاقات میں بتایا کہ مجھے مولانا کی گفتگو نے نہایت متاثر کیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت تک میں جن ذہین سیاستدانوں سے ملا ہوں ان میں مولانا ایک سربرآوردہ سیاست داں ہیں۔

مولانا میں ذاتی محاسن بے شمار ہیں۔ مثلاً وہ جماعت کے لیے اپنی ذات اور اس کی ہر بلندی کو تیاگ دینے کے قائل

ہیں اوران کی زندگی میں بے شمار ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انھوں نے اپنی جماعت کے لیے بڑے سے بڑے ایثار کو گوارہ کرلیا۔ دوستوں کے دوست ہی نہیں بلکہ ان پر جی جان سے نچھاور بھی ہوتے ہیں، آپ کی تنظیمی صلاحیت بے پناہ ہے لیکن اب وقت کے صدموں نے انھیں کسی حد تک ''تن آساں'' بنادیا ہے۔ سوچتے ہیں کرنا بھی چاہتے ہیں اور من میں آرزوئیں بھی شعلہ بن کر لہراتی ہیں لیکن پھر مسلمانوں کی سیاست کے مزرعہ ویراں پر نظر ڈالتے ہیں تو اقبال کی زبان میں یہ کہہ کر چپ ہوجاتے ہیں

مراچہ حاصلے کشت خرابے

اقبال کی زبان میں نہیں بلکہ اپنے تصور کی زبان میں.....؟ کیونکہ آپ اور شاعری دو مختلف چیزیں ہیں اور نہ معلوم قدرت نے آپ سے اس ذوق کو کیوں سلب کرلیا ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں کہ ان کی طبیعت چیزوں کی رعنائی سے لے کر ادب کی خوبصورتی تک کی والہ وشیدا ہے اوران کی زندگی کا بیشتر حصہ شعر ونغمہ کی مجلس آرائی میں صرف ہوتا ہے۔ مگر مولانا حبیب الرحمٰن سرتاپا شاہ جی کا تضاد ہیں۔ نہ شعر سے دلچسپی نہ حسن سے لگاؤ نہ نغمہ سے اٹکاؤ اور نہ زندگی کے جمالیاتی دھاروں سے رغبت، ایک خشک انسان جس کا نغمہ بانگ وصلوٰۃ، جس کا حسنِ چہرہ محراب اور جس کی معراج رسن و دار کی تماشہ آرائی ہے۔

سالہا سال آل انڈیا مجلس احرار کے صدر رہے اور نہایت طنطنہ سے کام کیا، جب صدر تھے تو بول چال کے تیور بھی صدارتی تھے۔ اب صدر نہیں تو صدر کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ یعنی یہ آپ کی فطری خوبی ہے کہ آپ تابع رکھ بھی سکتے ہیں اور رہ بھی سکتے ہیں، ان لوگوں کی طرح نہیں جو اقتدار کے منصب سے ہٹ کر خلقی افتاد کی نقش آرائی پر آتے ہیں۔ جیسا کہ بعض لوگوں میں دیکھا گیا ہے۔

آپ نے ۵۴ برس کی عمر میں دس سال چھے مہینہ قید خانہ میں گزارے ہیں اور یہ زندگی کا پانچواں حصہ ہے۔ لطف یہ کہ ہندوستان بھی کائنات انسانی کی کھیپ کا پانچواں ہی حصہ ہے۔

عام حسابی قاعدہ کی رو سے دیکھا جائے تو ہفتہ میں ڈیڑھ دن آپ نے جیل خانے کی نذر کیا ہے۔ اور دن رات کے چوبیس گھنٹہ میں پانچ گھنٹہ ایسے ہوتے ہیں جو زنجیر وسلاسل کی بستگی میں صرف کیے ہیں۔

آپ کی طویل قید پانچ برس کا وہ زمانہ ہے جو آپ نے اس دفعہ قانون دفاع ہند کے تحت بسر کیا اور استقلال کے ماتحت تھے پر شکن تک نہ اُبھری۔ لیکن اس قید نے جہاں آپ کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ وہاں دماغ میں عفو ودرگزر کا خانہ بھی قدرے مشتعل ہوگیا ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ شبنم کی جگہ انگارہ نے لے لی ہے۔

مولانا شروع شروع میں احرار کا دل سمجھے جاتے تھے لیکن اب اُنھیں دماغ بھی کہا جاتا ہے۔ میر نے درست ہی کہا ہے:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس ، تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی